بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قومی سیرت کانفرنس کا راولپنڈی میں انعقاد (۲۰ - ۲۱ فروری) حکومت اور محکمۂ اُمورِ دینیہ کا ایک مبارک کارنامہ ہے۔ مبارک کارنامہ نہ صرف موضوع کے لحاظ سے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ سالِ رفتہ کی سیرت کانفرنس کے مقابلے میں اس کانفرنس کا رنگ بہت مختلف تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ پورا نقشہ ہی تبدیل ہوگیا ہے۔ کسی معاشرے میں تبدیلی جب آئے تو اس کے اثر سے زندگی کے ہر شعبے اور دائرے میں افراد کے رویوں اور حکومت کی پالیسیوں کو بدل جانا چاہیے، بلکہ خود مردانِ کار کی ساری ترتیب دگرگوں ہوجاتی ہے۔ بہرحال زندگی کے دوسرے شعبوں سے قطعِ نظر، قومی سیرت کانفرنس کے داعیان اور مدعوئین، مختلف نشستوں کے اصحابِ صدارت اور مقالہ نگار سب کچھ پہلے سے مختلف تھا۔

حکومت اور محکمۂ امورِ دینیہ کے سر ایک اچھے کام کا سہرا باندھنے میں ڈاکٹر امین اللہ وثیر کا حصہ بے حد نمایاں تھا۔ جو متذکرہ محکمے کے ڈائرکٹر جنرل اور سیرت کانفرنس کے داعیان و منتظمین میں پیش پیش تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے اگرچہ بالمشافہ ملاقاتیں کم ہی ہوئیں، مگر میری معلومات یہ ہیں کہ موصوف نے اپنے اب تک کے دور میں علمی، تعلیمی اور دینی حیثیت سے دین و وطن کی بہترین خدمات بڑے صاف ستھرے کردار کے ساتھ ادا کی ہیں۔ یوں تو سیرت پاک کا موضوع ہی ایسا ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہنا باعثِ ثواب ہے، مگر چونکہ میرا تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ سیرت النبیؐ کے اسٹیج سے بسا اوقات غلط قسم کے رجحانات اچھالے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میری نظر اس بات پر رہتی ہے کہ مرکزی کارپرداز کون ہے۔ دعوت نامہ چونکہ ڈاکٹر امین اللہ وثیر کا جاری کردہ تھا۔ اس لیے میں نے کسی تامل کے بغیر پورے اعتماد سے اسے قبول کرلیا۔

پہلی نشست چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق صاحب کے افتتاحی خطاب کے لیے مخصوص تھی، یہ جذبہ انگیز تقریر اخبارات میں آچکی ہے۔ اس تقریر نے سامعین کے اندر نظامِ اسلامی کے تمنا کے چراغوں کی لو اُمید کا تازہ روغن ڈال کر بڑھا دی۔

باقی نشستوں میں تقریباً چالیس مقالہ نگاروں کو اپنی اپنی فکر و تحقیق کا ماحصل اپنے پسندیدہ موضوعات کے مطابق پیش کرنا تھا۔ فہرست دیکھی تو بہت سی شخصیتیں جانی پہچانی تھیں، بعض سے غائبانہ تعارف بھی تھا۔ کچھ لوگ نئے بھی تھے جن میں "خواتین" زیادہ اور "حضرات" کم تھے۔ ڈاکٹر اے وحید قریشی، ڈاکٹر اے ڈبلیو جے ہالیپوٹا، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن پشاور، پروفیسر کرار حسین (جن سے ریڈیائی لہروں کی معرفت شناسائی تھی)، مولانا محمد ایوب جان بنوری، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر حافظ احمد یار، مولانا تقی عثمانی، صاحبزادہ پیر محمد کرم شاہ، پروفیسر بیگم زینب کاکاخیل اور جناب اے کے بروہی (پہلے روز کی دو نشستوں کے صدر) ایسے اصحاب ہیں جن سے یا تو ملاقات کا موقع ملا، یا اُن کے مقالات سُنے، بعض مدعوئین مثلاً مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، حکیم محمد اشرف، ڈاکٹر اسرار احمد دیکھنے میں نہیں آئے۔ شاید کسی ایسی نشست میں پہنچے ہوں جس میں مَیں حاضر نہ ہو سکا۔ اسی طرح ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی معذرت کی اطلاع مجھے مل گئی تھی۔ کانفرنس میں ایسے اہلِ ایمان و شعور حضرات کا غلبہ دیکھ کر اُمید بندھی کہ ٹیڑھی باتیں کرنے والوں کے لیے میدانِ تنگ و تاریک خاصا تنگ ہے۔

جن مقالات یا تقاریر سے استفادہ کرنے کا مجھے موقع ملا، ان میں خاص اہمیت جناب اے کے بروہی، پروفیسر مرزا محمد منور، مولانا تقی عثمانی، پروفیسر بیگم زینب کاکاخیل، حافظ احمد یار کے افکار کو حاصل ہے۔ پھر بطورِ خاص مَیں جناب کرار حسین کے صدارتی خطاب کو اہمیت دیتا ہوں۔ وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولے، جذبۂ ایمانی کے ساتھ فلسفہ کا رنگ جھلکتا تھا۔ تکلّم بڑے وقار سے جاری رہا۔ بیان میں کشادہ دلی اور مطالب میں بڑی وسعت نمایاں تھی۔ جن دل پسند اصحاب کو نہیں سُن سکا، اُن کے بارے میں تو کیا کہوں، البتہ یہ حضرات جنھیں سُنا، اُن کے مقالات کا مجلس پہ گہرا اثر دیکھ کر یہی رائے دے سکتا ہوں کہ مجلس پہ انہی اہلِ دل و نظر کا رنگ غالب رہا۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک!

مگر مغربیت کے پروردہ کردہ انتشاری رجحانات نے بھی سیرت طیبہ کے اسٹیج پر اپنی کچھ نہ کچھ جھلکیاں دکھا ہی دیں۔ اور آفرین ہے کج فکر عناصر کی جرأت پر کہ وہ نہ کسی مجلس کی فضا کو دیکھتے ہیں، نہ غالب رجحانات کی پروا کرتے ہیں۔

نشست دوم کے لیے ہم جمع ہوئے تو مقالات کے اعلان شدہ پروگرام کے بجائے یکایک ایک اعلان ہوا کہ مس فلاں اور بیگم فلاں میجک لنٹرن کے ساتھ سیرت کے متعلق ایک پروگرام پیش کریں گی۔ تمام چہرے سوالیہ نشان بن گئے کہ بیچ میں یکایک یہ پروگرام کدھر سے آگیا ہے اور اعلان شدہ پروگرام کیوں مؤخر کر دیا گیا ہے۔ خیر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے زیر استعمال ہال کی زیادہ روشنیاں گل کر دی گئیں، صدر مجلس جناب اے سکے۔ بروہی اور اسٹیج سیکرٹری اور ان کے معاون نیچے آکر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے، کیونکہ میجک لنٹرن کی تصاویر دکھانے کے لیے پردۂ سفید کرسیٔ صدارت کی پیچھے کی دیوار پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اب پروگرام شروع ہوا جو اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ ایک کارکن میجک لنٹرن کو ہینڈل کر رہے تھے، ہر تصویر آنے پر ایک نوجوان صاحبزادی ڈائس سے ڈرامائی مکالموں کی طرح یاد کیے ہوئے چند جملوں پر مشتمل ایک مختصر سی تقریر کرتیں، پھر ان کے قریب بیٹھی ہوئی ایک خاتون نہ صرف کھلے چہرے کے ساتھ، بلکہ میک اپ کے ساتھ فنی مہارت سے کوئی ایک نعتیہ شعر پڑھتیں، پھر نئی تصویر آتی اور پھر وہی چکر چلتا۔ میجک لنٹرن کی یہ مصیبت کہ اس میں خرابی تھی اور صرف بیت اللہ، مسجد نبوی، صفا اور مسجد ذوقبلتین کی تین چار تصاویر ہی سامنے آسکیں اور وہ تصاویر بھی فنی معیار کے لحاظ سے معمولی تھیں۔ صاحبزادی جو جملے بولتی ہیں ان میں تصنع کا رنگ غالب تھا۔ مزید ستم یہ کہ تلفظ کی نہایت فاش غلطیاں۔ سیرت کے بارے میں جو مواد پیش کیا گیا اس کی سطح بس یہ تھی کہ کسی سکول میں طلبا یا طالبات کو کچھ عام سی معلومات مل جائیں۔ شرکائے مجلس دو چار منٹ کے بعد "بور" ہونے لگے، مگر معاملہ سیرت کا تھا لہٰذا خاموش بھی رہے۔ اپنا حال تو یہ تھا کہ جیسے اعصاب چند ہی لمحوں میں چور چور ہو جائیں گے۔ ستم ظریفی کی حد ہے کہ یہ سمعی و بصری پروگرام آدھ پون گھنٹے تک طول پکڑ گیا، حالانکہ فاضل مقالہ نگاروں سے وقت کی قلت کے پیش نظر دس دس منٹ میں اپنے اپنے مقالات کا محض تعارف کرانے پر اکتفا کرنے کی درخواست بار بار کی گئی۔ آخر اس چکر سے نجات دلانے کے لیے نماز کام آئی۔ نماز کے وقت کا مطبوعہ پروگرام میں جو اندراج تھا، اس کے مطابق منتظمین نے نشست کے خاتمے کا اعلان کر کے علما اور ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی جان بخشی کرائی، ورنہ وہ سب یہاں سے مڈل اسکول کے طلبہ بن کے اٹھتے۔ خاتمہ جس خاموشی اور اداسی کے ساتھ ہوا، اور پھر سب لوگ اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے جس

بے تابی سے ہال سے نکلے، اس سے بہتر داد اس ستم ظریفی کی کیا ہو سکتی تھی۔[1]

بعدہٗ چند اچھے مقالات کے خلاصے سن کر جی خوش ہو گیا۔ ایک صاحب[2] نے انگریزی میں اپنے مقالے کے چند اقتباس سنائے جو اجتہاد کے موضوع پر تھے۔ اندازِ بیان اشاراتی سا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ صراحت سے گریز کیا گیا ہے۔ ان اقتباسات کو سن کر یہ تاثر ہوتا تھا کہ اب انسانیت عقلی بلوغ کے جس دَور میں داخل ہو چکی ہے اس میں وحی کے متعین حدود سے زیادہ وسیع دائرے میں سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔ اجتہاد کے متجددانہ تصورات پہلے بھی اس ملک میں بار بار وضاحت سے لائے جا چکے ہیں، اور ان تصورات میں سے کسی نے جڑ نہیں پکڑی۔ تاہم اس مضمون کو سن کر قدرے کوفت ہوئی۔ اس قسم کے مباحث اگر کسی کو اُٹھانا ہی ہوں تو کسی بھی ہال اور کسی بھی جریدے میں اُٹھائے جا سکتے ہیں، آخر تذکرۂ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجالس ہی کی فضا کو کیوں غبار آلود کیا جائے۔ یہاں لوگ فلسفہ ہائے جدت سننے کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے، یہاں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی چھاؤں میں انسانیت کے معیاری نمونے کی سوانح و سیرت اور تعلیم و پیغام کی یاد تازہ کرنے کے لیے اہلِ دل اور اہلِ دماغ دُور دُور سے آئے تھے۔ مغرب کے نفوذ کردہ ترقی و جدت کے فلسفوں کے لیے اپنے شگوفے چھوڑنے کو معاشرے کی بہت سی پہنائیاں موجود تھیں۔

فاضل صدرِ مجلس کے دل میں بھی احساس کی لہر اُٹھی، اور انہوں نے فرمایا کہ صاحبِ مقالہ کو اپنے یہ خیالات کھل کر اُردو میں پیش کرنے چاہئیں تھے، اور بعد کی صدارتی تقریر میں انہوں نے اس خوبی سے سلسلۂ نبوت، ضرورت وحی، انسانیت کے عقلی بلوغ اور مسئلہ اجتہاد کو مثبت انداز میں پیش کیا کہ بے اختیار اُن کے لیے دعائیں دل سے اُٹھیں۔

---

[1] سیرت پاک کو کھیل تماشے کے رنگ میں پیش کرنے پر مجھے جو غم آمیز اضطراب ہوا، اس کے دباؤ کی وجہ سے مجلس سے اُٹھتے اُٹھتے یہ جملہ معتدل سی آواز میں میری زبان پر آ گیا۔ THE CLASS IS VERY THANKFUL (FOR SUCH A GOOD LESSON

[2] میں نے بعض وجوہ سے دانستہ اس طرح کے تمام نام حذف کر دیے ہیں۔ کیونکہ مسئلہ کسی کی ذات کا نہیں، ایک قابلِ احترام موضوع کے تقاضوں اور اس پر پیش کیے جانے والے غلط مواد کا ہے۔

ایک اور صاحبہ بھی اپنا کام کر گئیں۔

بظاہر وہ یہ بحث لے کے آئی تھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا۔ مگر وہ بلندیٔ رتبہ کا کچھ ویسا ہی مفہوم سمجھتی تھیں جیسا کہ دورِ حاضر کی مادہ پرستانہ تہذیب نے پھیلا دیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی گھسے پٹے قصے کو لے بیٹھیں جسے جدت طرازوں نے کئی بار یہاں چھیڑا، مگر بات بنتی نہیں۔ محترمہ نے سکینہ بنت حسین کا تذکرہ کیا کہ وہ ثقافتی لحاظ سے بڑا رتبہ بلند رکھتی تھیں اور موسیقی کی فن کار ہی نہیں، استاذ تھیں۔ گویا (نعوذ باللہ) چمنستانِ محمدی ایسے ہی گل کھلانے کے لیے آراستہ ہوا تھا۔ کسی کو اس سلسلے میں دادِ تحقیق دینی ہو تو وہ یہ دکھا دے کہ آیا حضورؐ کو ذوقِ موسیقی تھا یا عمر بھر میں چار چھ بار انھوں نے راگ رنگ کی محفلوں میں شرکت کی، یا کتنے موسیقی کے ماہرین و ماہرات عہدِ سعادت اور خلافتِ راشدہ کے چار ادوار میں پیدا ہوئے۔ (خدا اس قسم کی مجبورانہ گفتگو پر بھی مجھے معاف کرے) تاریخ کے یہ سارے ورق اُلٹ کر یکایک ایک نام سکینہ بنت حسین کا اچھال دیا جاتا ہے جسے سن کر مطالعہ سے محروم لوگ اس مغالطے میں پڑ جاتے ہیں کہ (خدا معاف کرے) یہ امام حسین کے گھرانے کا ذکر ہو رہا ہے۔ حضورؐ پر ایمان رکھنے والوں کی ذمہ داری تو ایسا بلند ہے، علمی و تحقیقی میدان میں قدم رکھنے والوں کو دورِ جدید کے پروپیگنڈا کے انداز میں لوگوں کو مغالطوں کا شکار بنا کر اُلّو سیدھا نہیں کرنا چاہیے۔ حقیقت یوں ہے کہ یہ نام "سَکینہ" نہیں، بلکہ "سُکَینہ" ہے اور حُسَین سے مراد سیدنا امام حسین نہیں، بلکہ بعد کی ایک عام شخصیت ہے۔ اب جس صاحبۂ مقالہ و تحقیق کو اپنے پیش کردہ کسی تاریخی نام کا تلفظ ہی معلوم نہ ہو، اس پر تحقیق کی تہمت چسپاں کرنا ہی زیادتی ہے۔ اس سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ یہ صاحبہ اہلِ علم کے ایک مجمع کو سیرتِ پاک کے اسٹیج سے خطاب فرماتی ہیں۔ پھر یہ قصہ کسی مستند تاریخی ماخذ سے نہیں لیا گیا بلکہ غالباً خاتونِ موصوفہ نے تو حوالہ بھی بیان نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے مقالۂ عالیہ میں کچھ اندراج کیا ہو۔ یہ قصہ کتاب الاغانی سے لیا گیا ہے جو تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ ادب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر اس میں رطب و یابس قسم کے لطائف و کثائف جمع کیے گئے ہیں، خصوصاً بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار اس میں منعکس ہیں۔ اس کتاب کا درجہ الف لیلہ سے ذرا سا بلند ہے، مگر کتبِ تواریخ سے بہت فروتر۔ خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور تلقینات کی بات کرنی ہو تو اصل بنا قرآن اور احادیث اور امہاتِ کتبِ سیرت پر رکھنی چاہیے۔ کوئی استفادہ ہوتا تو موطا یا بخاری سے ہوتا، کوئی تذکرہ بیان کیا جاتا تو اس کی بنیاد ابن اسحٰق اور ابن ہشام، یا طبری اور بلاذری کی مستند روایات پر ہوتی۔ یہ کیا

تک ہے کہ بیان ہو رسولِ پاک کے مقرر کردہ مرتبہ نسائیت کا اور قصہ سنایا جائے کتاب الاغانی میں سے۔ مگر خاتون اس قسم کے احساسات سے بہت بلند ہو کر اپنی پسندیدہ فضا میں اُڑتی چلی جا رہی تھیں۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست کچھ مضطرب سے ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اب اس کا توڑ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ سوالات کے وقفے میں ان سے صرف حوالہ پوچھ لیجیے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ چنانچہ مقالہ کی تلخیص پیش کر کے وہ سدھارنے لگیں تو میرے ہم نشیں نے پوچھ ہی لیا کہ محترمہ آپ کے بیان کردہ قصے کا حوالہ کیا ہے؟ اس پر وہ کہنے لگیں کہ بس اب جانے بھی دیجیے، یہ کہتے کہتے وہ اسٹیج سے اُتر گئیں اور اسٹیج سیکرٹری نے اگلے مقالہ نگار کا نام پکارا۔ اصل میں مجمع بھی اُن صاحبہ کی گفتگو سے اتنا اُکتایا ہوا تھا کہ لوگوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ نجات ہوئی۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

ایک چیز اور دوسرے روز دوپہر کے قریب دلچسپ رہی۔

پروفیسر حافظ اللہ یار صاحب نے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ تعلیم و تربیت پر مقالہ پڑھا۔ حافظ صاحب مطالعہ رکھتے ہیں۔ اور وادیٔ تحقیق میں بھی لیلیٰ معنی کے محمل کا تعاقب کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کی بات کو وزنی اور مؤثر ہونا چاہیے تھا اور وہ تھی۔

انہوں نے مقالہ ختم کیا تو حسبِ اعلان مجمع کو دعوتِ سوالات دی گئی۔ مجھ سے ڈیڑھ گز کی دُوری پر اگلی قطار میں ایک نوجوان بیٹھے تھے، وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سوال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس بات کی اوّلیت اسلام ہی کو حاصل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں دنیا میں مخلوط نظامِ تعلیم کا آغاز ہوا، چنانچہ بعض خواتین سے مردوں نے اور بعض مردوں سے خواتین نے علم حاصل کیا۔ لیکن آپ کے مقالے سے بالکل دوسرا ہی تاثر حاصل ہوتا ہے۔

سلسلۂ گفتگو کو ذرا ایک طرف چھوڑ کر آپ ذرا اخرافی ذہنوں کی جسارت دیکھیے کہ بجائے اس کے کہ وہ دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ کی عمرانیاتی خصوصیات کو تسلیم کر کے اس طرح کی باتیں کریں کہ نئے زمانے کی کچھ نئی ضروریات ہیں، اور شریعت ہر زمانے کے لیے ہے، لہٰذا اجتہادی طور پر ہمیں مخلوط تعلیم اور بے پردہ معاشرت کے لیے راستہ نکالنا ہی ہوگا، اُلٹا اب انہوں نے یہ نیا انتہا پسندانہ اور جارحانہ موقف ڈھونڈ نکالا ہے کہ مخلوط تعلیم کا تو راستہ ہی ہمارے نبیؐ نے کھولا تھا۔ اب اس جارحانہ دعوے

کے مقابلے میں کرتے رہیے مدافعانہ استدلال ۔ بحث و اختلاف میں حریف کی مہارت کی ایک شکل یہی ہوتی ہے کہ وہ مثبت موقف رکھنے والے داعیانِ حق کو دھکیل کر مدافعانہ مقام تک لے جائیں۔ یہی حربہ ایک نوجوان نے ایک پختہ سال استاذ کے خلاف استعمال کیا۔

مگر حافظ صاحب نے اپنے ایمان اور مطالعہ و زورِ استدلال کی سرشاری میں بڑے سادہ سے اسلوب میں جواب دیا اور انہوں نے فضا صاف کر دی۔ حافظ صاحب نے دو باتیں کہیں: ایک یہ کہ میں نے جو بحث کی ہے اس کا تعلق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور اسوہ و تعلیم سے ہے۔ بعد کے رنگا رنگ ادوار بالکل الگ چیز ہیں۔ ہمارے لیے اموی اور عباسی یا کسی اور زمانے کو دینی حیثیت سے مثال نہیں قرار دیا گیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ دورِ نبوتؐ اور دورِ خلافت راشدہ کے بعد بھی حالات کے بگاڑ کے باوجود تابعین اور تبع تابعین کے ہاں ایسا کوئی تعلیمی نمونہ نہیں ملتا ہے کہ مرد اور عورتیں ایک بنچ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں، یا عورت بہ حیثیت استاد اور بہ حیثیت شاگرد مردوں کے سامنے کھلے چہرے کے ساتھ آئے۔ جن خواتین نے مردوں کو تعلیم دی انہوں نے بھی پردے میں بیٹھ کر دی، اور جنہوں نے مرد اساتذہ سے پڑھا سیکھا انہوں نے بھی حجاب و نقاب کا پورا اہتمام کیا۔

پھر حافظ صاحب نے بطور جملہ معترضہ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے نبی کی تعلیم یا ہمارے دین کا مقرر کردہ طریقہ جو کچھ ہے اس پر آخر شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں اور ساری دنیا سے مختلف اپنے اطوار و اقدار کو مضبوطی سے لے کے چلتی ہیں۔ مثلاً اسرائیل کے پروٹوکول میں یہ بات شامل ہے کہ پوری ریاست میں لحم خنزیر (PORK) نہیں ملے گا۔ باہر سے سفیر اور سیاح اور کاروباری اصحاب ہزاروں کی تعداد میں جاتے ہیں لیکن کوئی شخص نہ سرکاری ضیافتوں اور مہمان خانوں میں، نہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کہیں بھی ایک شئے ممنوعہ کو نہیں پا سکتا۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی نہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے، اور نہ اس کمی پر اسرائیل کو فرسودگی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیتا ہے۔ دوسری مثال انہوں نے سعودی حکومت کی دی کہ ان کے سربراہان جب بھی انڈیا میں گئے تو کسی نے گاندھی جی کی سمادھی پر جا کر پھولوں کی چادر نہیں چڑھائی اور نہ اُن سے ایسی اُمید رکھی، نہ کوئی شکایت ہی پیدا ہوئی۔ کوئی شخص یا قوم اگر اپنے مسلک و شعار کو اعتماد کے ساتھ اختیار کرے اور اعتماد کے ساتھ دوسروں کے سامنے رکھ دے تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ اسی طرح اگر پاکستان میں بھی مخلوط تعلیم و معاشرت کا انسداد کر دیا جائے تو بھینچے شرمانے کی ضرورت (باقی بر صفحہ ۴۴)

(بقیہ اشارات) نہیں۔ یہ گفتگو انہوں نے مستفسر کے ہم خیال عنصر کی کمزور ذہنیت کا علاج کرنے کے لیے کی۔ بہرحال لطف آگیا۔ حافظ صاحب کے مقالے کا اثر اور بڑھ گیا۔

فہرست شرکا میں جو دو تین نام میری حیرت کا باعث ہوئے، ان میں نمایاں ترین ایک شعبے کے ایسے سربراہ کا نام تھا، جن کے خیالات کے خلاف پنڈی کے پریس میں پہلے ہی تموج[1] تھا۔ اُن کی کہی ہوئی جن باتوں پر لوگ مضطرب تھے، ان باتوں کا صاحب موصوف نے دھڑلے سے اثبات کیا۔ ایسے اصحاب کا اسلامی خدمات کے اداروں میں برسرِ مناصب رہنا تو ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہم تو صرف یہ سوچتے ہیں کہ ان کو قومی سیرت کانفرنس کے سٹیج پر طلب کرنا کیا ضرور!

موصوف کے خیالات کا یہاں جائزہ لینا مطلوب نہیں، مگر اتنا اندازہ ہے کہ وہ ایک ایسے سیکولر اسلام کو پسند کرتے ہیں جو صوبوں اور نسلوں ہی سے نہیں، لوگوں کے اعتقادات سے بھی بالاتر ہو کر کام کرے۔ مگر کون ایسے حضرات کو بتائے کہ دُنیا میں سیکولرازم بُری طرح فیل ہو رہا ہے جس کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ مختلف مذہبوں کو جوڑ کر جو سیکولر وطنی قومیتیں بنائی گئی تھیں وہ دُنیا بھر میں ٹوٹ رہی ہیں۔ اس کا ایک بڑا تجربہ تو برصغیر ہی میں پیش آیا، مگر اب یہ دیکھ لیجیے کہ قبرص، حبشہ، فلپائن وغیرہ ممالک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا رشتۂ قومیت درہم برہم ہو رہا ہے۔ اسرائیل نے عربوں کو عالمی قوتوں کے مواعید اور اعلانوں سے منہ موڑ کر بے وطن کر دیا ہے، لبنان اور کئی دوسرے علاقوں میں عیسائی اقلیتیں مسلم اکثریتوں کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ مسلمانوں کو درکنار رکھیے، خود برطانیہ کی عیسائی قومیت اب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کو یکجا رکھنے کے لیے آخری مرحلے کی کوششیں کر رہی ہے۔ مگر ہمارے سیکولر مسلمان ابھی تک مذہب سے بالاتر کسی معجونِ فلک سیر کے نشے میں ہیں۔

مجھے ایک اور چیز نے حیرت میں ڈال دیا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے جو افتتاحی خطاب

---

[1] ان کا معاملہ ایسا تھا جیسے ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ: (THE PATIANT WITH A HISTORY) ایسے لوگوں کے کاندھے پر ان کے ماضی کا ریکارڈ لدا ہوتا ہے، اور اُن کی لوحِ جبین پر ان کی اپنی تحریریں درج ہوتی ہیں۔

فرمایا۔ اس میں متعدد بار اسلامی نظام کے الفاظ استعمال فرمائے۔ کوئی دوسری متبادل اصطلاح تقریر میں نہیں آئی۔ خود میں نے یہ پوری تقریر سنی۔ لیکن ٹیلی وژن میں اصل تقریر سنانے کے علاوہ ایسا بھی ہوا کہ رپورٹنگ میں اسلامی نظام کے بجائے نظامِ مصطفیٰؐ کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ بلحاظ حقیقت کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ میں خود بھی بارہا نظامِ مصطفیٰؐ کی ترکیب استعمال کرتا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں سب سے بڑی سیاسی قوت رکھنے والی شخصیت کی بات ذرائع ابلاغ سے پیش کرنے والوں کو یہ جسارت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اس کے استعمال کردہ الفاظ و اصطلاحات میں اپنی طرف سے ردّ و بدل کریں، خواہ اُن کی نیت اچھی اور ذہن معصومانہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر بطورِ خاص اس کی اجازت لے لی گئی ہو تو معاملہ دوسرا ہے۔ دراصل ٹیلی وژن اور دوسرے ادارہ ہائے نشر و ابلاغ میں چونکہ ایسے حضرات موجود ہیں جو " اَقُوْلُ " کو " قَالَ " بنا سکتے ہیں، لہٰذا ٹیلی وژن کے حالیہ ہنگامے کے حوالے سے جب ذرا سی تحریف پر نظر جاتی ہے تو تشویش ہوتی ہے۔ یہ تشویش میں نے دو ایک اور ذمہ دار اصحاب میں بھی پائی۔ مگر خاموشی ہی مناسب سمجھی کہ اس رائی کے پیچھے کے پہاڑ کو جب ہم دیکھ نہیں سکتے تو پھر کسی اہم جگہ تک اس حصّے کو پہنچائیں ہی کیوں؟

ایک بات تھی، ہم نے محسوس کی بعض نے بالکل محسوس نہ کی ہوگی اور سب کچھ رفت گذشت ہو گیا۔ شُد آنچہ شُد۔

بارے کچھ اپنا بیان بھی ہو جائے، ہر چند کہ یہ "حسن طبیعت نہیں مجھے"۔

پہلے دن بعد مغرب کی نشست میں مجھے موقع ملا۔ میں نے اپنے مقالہ میں حسبِ عادت مروّج مباحث کو چھوڑ کر ایک نیا قصہ اُٹھایا تھا۔ عنوان تھا، "حضورؐ کا عطا کردہ نیکی کا تصوّر"۔ اٹھارہ بیس صفحے کے مقالے کا تصوّر سامنے آتا تھا جسے قومی سیرت کانفرنس کے دو روزہ بھاری پروگرام کی وجہ سے میں نے مختصر کر کے چار پانچ صفحوں میں سکیڑ دیا۔ اور جب پیش کرنے کا وقت آیا تو جو اوسط وقت میرے حصّے میں آتا تھا وہ دس منٹ تھا۔ مجبوراً لکھے ہوئے صفحات ایک طرف رکھ دیے اور مختصر سی تقریر کر دی۔ بس ایک ہی بنیادی نکتہ بیان ہو سکا۔ وہ یہ تھا کہ نگار خانۂ تخلیق کا وہ پیکرِ اوّلیں جس کے اندر نیکی اور بدی کی کشمکش کی چنگاری پہلی بار دہک اُٹھی، اسی سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور یہی وہ اہم جوہر ہے جو اسے تمام دوسرے حیوانات سے الگ کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ نیکی کا راستہ تلاش کرنے اور بار بار بھٹک کر تباہ ہونے کی رُوداد

پر مشتمل ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی آمد کا مقصد یہی تھا کہ وہ محض کامیابی، فتح اور خوشی کے راستوں کو نیکی کا راستہ سمجھ کر چلنے والوں کو اُن کے مغالطوں سے نکال کر نیکی کے روشن صراطِ مستقیم پر ڈال دیں۔ انبیاء اور علی الخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بتاتی ہے تمام نیکیوں کا آغاز اس بات سے ہے کہ آدمی اس سلطنتِ کائنات میں اپنا صحیح مقام جان لے۔ اس کائنات کا ایک خدا ہے، یہ ساری اس کی سلطنت ہے اور اس کی تمام مخلوق اس کی رعایا ہے۔ انسان کا صحیح مقام بھی یہی ہے کہ وہ فرمانروائے کائنات کے ساتھ عبدیت کا معاملہ رکھے۔ خدائے واحد کو ماننے کے بعد اسی سے دوسرا تصور یہ حاصل ہوتا ہے کہ تمام انسان عبدیت کے مساویانہ مقام پر ہونے کی وجہ سے مساوی ہیں اور ان میں اُونچ نیچ نہیں۔ یعنی وحدتِ رَبّ کے ساتھ وحدتِ آب، یا وحدتِ الٰہ کے ساتھ وحدتِ انسانیت کا تسلیم کرنا لازم ہے۔ پھر انہی تصورات پر یہ امر بھی مبنی ہے کہ پوری کائنات ایک ہی خدائے کارفرما کی سلطنت ہے جس پر ایک ہی طبیعاتی، ریاضیاتی اور حیاتیاتی قوانین عمل کر رہے ہیں۔ پس وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے ساتھ وحدتِ کائنات کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ مزید ایک علم جو آنحضورؐ کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے وہ وحدتِ حیاتِ انسانی کا علم ہے۔ یعنی آدمی کی زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا کہ ہر خانے کا الٰہ اور ہر خانے کا دین الگ الگ ہو۔ اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ایک شعور وحدت تاریخ کا شعور ہے۔ یعنی ساری تاریخ انسانی پر ایک ہی نوامیسِ الٰہی جاری ہیں اور ہر دور میں سنت اللہ ایک ہی رہتی ہے۔ ہر دور میں انبیاء کی دعوت ایک ہی تھی، اس کا اثر قبول کرنے والوں اور انکار کرنے والوں پر یکساں ہوا، ان کے خلاف ایک ہی طرح کے الزامات اور شدائد اُبھرے، اُن کی تربیت سے ایک ہی جیسے کردار نمودار ہوئے، اور اُن کی دعوت کو قبول یا مسترد کرنے والی اقوام کو ایک ہی جیسے نتائج ملے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ قرآنی نظریۂ وحدت تاریخ دے کر یہ واضح کر دیا کہ تاریخ کے مختلف ادوار کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ کسی پچھلے دور کے تجربات سے بعد میں کوئی استفادہ کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔

اس بنیادی مبحث کو میں نے یہ کہہ کر سمیٹا کہ یہ ہے توحید کا وہ جامع تصور جس کی بنا پر ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ توحید راس الطاعات ہے۔ جو شخص حقیقت سے مطابقت رکھنے والے عقیدۂ توحید کے مطابق نظامِ کائنات میں اپنا صحیح مقام قبول نہیں کرتا وہ اس سلطنتِ کائنات کا جائز شہری نہیں ہے۔ اس کا باغیانہ روّیہ

اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی تلافی بڑی سے بڑی جزوی نیکیوں سے نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص خیراتی ہسپتال کھولے یا گلیوں میں صفائی کرتا پھرے، یا لوگوں کو وظیفے اور اعانتیں دے۔ یا علوم اور فنون کے دائروں میں کارنامے دکھائے، ان چیزوں سے اس کے بنیادی جرم کی تلافی نہیں ہو سکتی، جیسے دنیوی ریاستوں میں کوئی باغی اگر ڈاکہ زنی کر کے دولت کی تھیلیاں غربا کے گھروں میں ڈالتا پھرے تو بھی قانون اس سے کوئی رعایت نہ برتے گا۔ بخلاف اس کے جس شخص نے اپنا صحیح مقام پا لیا، خدا کے ساتھ طاعت و بندگی کا رویہ اختیار کیا، انسانوں کے ساتھ محبت، اخوت اور خدمت کا مسلک اپنایا تو اس کی عبادات اور اذکار تو عبادت ہیں ہی، اس کی تمام زندگی عبادت کے دائرے میں آ سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ واضح کیا کہ ایسے مومن کی مختلف دینی سرگرمیاں اور بندوں کی خدمات، یہاں تک کہ راستے سے روڑے، کانٹے ہٹا دینا صحیح مقصد کے لیے تیر اندازی سیکھنا یا اہل باطل کے شعر و ادب اور ان کے محاذِ خطابت وغیرہ کا جواب دینا نیکی اور صدقہ ہے، وہاں کسی خدا پرست کا لوگوں سے مسکراتے ہوئے ملنا، ان سے قول معروف کہنا، بلکہ دوسروں کو اذیت پہنچانے سے باز رہنا صدقہ ہے۔ اپنے اہل و عیال کو حلال کی روزی بہم پہنچانا صدقہ ہے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بروئے حدیثِ رسولؐ لوگوں کا اپنی ازواج کے ساتھ خوش وقت ہونا بھی صدقہ ہے۔ ایسے شخص کی وفادارانہ زندگی میں نادانستگی یا جذباتی ہیجان میں اگر کچھ لغزشیں ہو جاتی ہیں تو ان سے نجات پانے کے لیے توبہ و اصلاح کا دروازہ کھلا ہے، پھر اس کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نادانستہ غلطیوں کا حساب ان تکالیف ہی کے بدل میں بے باق ہو جاتا ہے جو اسے دنیوی زندگی میں پیش آتی ہیں۔

یہ دراصل میرے مختصر شدہ مقالے کا تمہیدی حصہ تھا۔ آگے کے چند نکات کا یونہی میں نے اجمالاً ذکر کر دیا اور مقررہ وقت میں بات ختم کر لی۔ سوالات کے لیے رُک گیا، مگر دس سیکنڈ میں معلوم ہوا کہ سوالات ناپید ہیں۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ نہ صرف مجلس پر اس گفتگو کا بڑا اچھا شگوار اثر رہا، بلکہ مجلس کے فاضل صدر جناب اے۔ کے۔ بروہی نے میری عاجزانہ گذارشات کو بھرپور توجہ سے سنا، اور اپنی خوبصورت صدارتی تقریر میں میری گذارشات کا حوالہ دے کر ان کو مزید تقویت پہنچائی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک!

آخر میں میں اتنا کہہ دوں کہ اُوپر جن چند غیر خوش آئند باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن سے ہرگز کوئی غلط فہمی نہ ہو جیسے کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، چونکہ مقالہ نگاروں اور سامعین کی بھاری اکثریت صحت مند تاثرات کی حامل تھی، اس لیے مجموعی طور پر کانفرنس بہت اچھی اور کامیاب رہی۔ جس کے لیے حکومت اور محکمہ اوقاف کے اُمورِ دینیہ، منتظمین اور شرکاء جزائے خیر کے مستحق ہیں۔ آخر گاڑی جب کھٹ کھٹاک کرتی کانٹا بدلتی ہے تو مسافروں کو کچھ دھچکے ضرور لگتے ہیں۔ مگر گاڑی کا رُخ اگر صحیح منزل کی طرف ہو جائے تو ہزار دھچکے گوارا۔